

ایک علم دوست شخصیت: سید محمد باقر شمس

جناب محسن مظفر نقوی صاحب

پوتے کے تاثرات“ سمجھا جائے گا، لہذا میری خواہش ہے کہ ایک قاری اور طالب علم کی حیثیت سے میں اس ”استاد بزرگ“ کے بارے میں اپنے تاثرات نقل کروں۔

مدارس کی زندگی اور حصول اسناد تک کا عرصہ ہر طالب علم کے لئے اہم ہوتا ہے اور ہر ایک کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے، جس کے نقش و نگار تلون پذیر، کبھی مدہم اور کبھی شوخ ہوتے ہیں۔ انسان کیونکہ انھیں دنوں نوجوانی کی منزلوں میں قدم رکھتا ہے، لہذا فطری طور پر ”اللہ جمیل و یحب الجمال“ ہی اس کا آئیڈیل جملہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں انسان عمق کے ساتھ ساتھ حسن پر بھی نظر رکھتا ہے۔ کوئی کتاب کتنی عمیق ہے، یہ امر اس کے لئے اہمیت ضرور رکھتا ہے، لیکن کتاب کتنی ”انیق“ ہے، یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتی۔ والد محترم ہمیشہ مولانا کے محترم کی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ”زبان کا مزاج“ اور ”چاشنی“ انھیں کتابوں سے سمجھ میں آئے گی۔ پروفیسر شوکت سبزواری نے کہا کہ لکھنؤ سے دو ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن کا مثل نہیں ہے۔ ایک آرزو صاحب کی ”نظام اردو“ دوسری شمس صاحب کی ”لکھنؤ کی زبان“۔

میں نے مولانا کی پہلی کتاب ”لکھنؤ کی تہذیب“ پڑھی تھی، جسے خریدتے وقت میں نے متعدد بار سوچا کہ اسے خریدا جائے یا نہیں۔ اس کی طباعت آنکھوں کو بھلی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ دوسری کتابوں کے بارے میں کتب فروش سے دریافت کیا تو بہت سی کتابیں اس نے سامنے لا کر رکھ دیں۔ تمام کتابوں کا معیار طباعت کم و بیش ایک سا تھا۔ یہ بات دوسروں کے لئے

ایک دفعہ میں اپنے والد مرحوم جناب تاثیر نقوی کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کے دفتر میں مولانا نسیم امروہوی کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ متعدد ماہرین لغت نویس بھی تشریف فرما تھے۔ کسی ہندی ترکیب پر گفتگو ہو رہی تھی۔ خالصتاً علمی مباحث چھڑے ہوئے تھے۔ اختلاف آراء کے سبب یہ بحث کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوتی نظر آرہی تھی کہ اتنے میں مولانا نسیم امروہوی مرحوم نے دروازہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: ”لو! مسئلہ حل ہو گیا، مولانا شمس تشریف لا رہے ہیں“۔ سب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ دریں اثنا مولانا کمرہ میں تشریف لائے تو سب نے تعظیم و توقیر کے بعد ”موضوع گفتگو“ مولانا کے سامنے پیش کیا جس مسئلہ پر نصف گھنٹہ سے بحث ہو رہی تھی مولانا شمس نے اسے پانچ منٹ میں حل فرمادیا۔

مولانا محمد باقر شمس صاحب میرے بزرگ ہیں اور مجھے ان سے شرف نیاز مندی حاصل ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ نے میرے دل پر مولانا صاحب کے بارے میں انتہائی گہرے اثرات چھوڑے۔ جناب کے نام نامی سے دیگر طالبان علم کی طرح میں بھی واقف تھا اور ان کی نگارشات کے توسط سے ان کا شاگرد بھی، لیکن، بد قسمتی سے بالمشافہ نیاز مندی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ مولانا کی عقیدت اور علمی ہیبت، جو مجھ پر سوار تھی، وہ مذکورہ بالا واقعہ کے بعد دو چند ہو گئی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، مولانا نے محترم میرے خاندانی بزرگ ہیں۔ اگر میں ان کی خصوصیات کا، جس حد تک بھی ادراک کر سکا ہوں، ذکر کرنے بیٹھ جاؤں تو اسے ”دادا کے لئے

حوصلہ شکن ہو تو ہو، میرے لئے یہ ایک نکتہ فکر ثابت ہوئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ جس شخص نے اتنی ایک کتابیں لکھی ہیں، تحقیق کی ہے، اپنا وقت صرف کیا ہے اور طباعت کی زحماتیں برداشت کی ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب و عالم کی کتابیں طباعت کے لحاظ سے عمدہ نہیں ہیں۔ اس سوال نے مجھے زیادہ دیر پریشان نہ رکھا۔ کتابوں پر رضویہ سوسائٹی کا پتہ چھپا ہوا تھا۔ وہیں کے ایک کتب فروش سے کتابیں خرید لی تھیں اور اسی سے دریافت کر کے میں مولانا نے محترم کے گھر پہنچ گیا۔

مولانا نے موصوف کتابوں کے جھر مٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کپڑوں پر کتابوں کی معمولی گرد کے اثرات نمایاں تھے۔ پیشانی عرق آلود تھی۔ مولانا اپنے کانپتے ہاتھوں سے ایک کتاب کو اٹھاتے اور کچھ دیورق گردانی کر کے دوسری طرف رکھ دیتے۔ پھر کانپتا ہوا ہاتھ کسی ضخیم ووزنی کتاب کے لئے مجھ جستجو ہو جاتا۔ کبھی تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ کسی الماری کی طرف تشریف لے جاتے اور ٹھیک اسی کتاب کو نکالتے ہیں، جس کی انھیں ضرورت ہوتی تھی۔ میں پندرہ بیس منٹ تک اس نظارہ میں محو رہا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ میں اجازت لینے کی غرض سے اٹھا۔ مولانا نے کہا:

”بیٹا معاف کرنا! ایک مسئلہ کو دیکھ رہا ہوں، تم سے بات نہ کر سکا۔ اچھا بتاؤ! تم کون ہو اور کس لئے آئے تھے؟ میں نے اپنا تعارف کروانا ضروری نہیں سمجھا کہ ”غبارِ خاطر“ کا سبب نہ بن جائے۔ عرض کی۔

”بس آپ کی زیارت کرنی تھی، التماس دعا“۔ میں نے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔

جب تک مولانا کی زیارت نہ ہوئی تھی، کتابوں کی طباعت پر غصہ تھا۔ مولانا کی زیارت ہوئی تو تمام غصہ کا فور ہو گیا اور اس بیس منٹ کی مشاہداتی نشست نے ”ایک علمی و فکری پیکر نابغہ روزگار“ شخصیت کا مشاہدہ کروایا تھا، جو اپنی جگہ دل خوش کن اور فرحت انگیز تھا۔ مولانا کے گھر سے باہر آیا تو مجھے قوم پر غصہ تھا، قوم

کی بے حسی اور بے پروائی پر آنسو بہانے کو جی چاہ رہا تھا۔ مولانا نے محترم نے علمی و ادبی تحقیق میں اپنی زندگی کو فنا کر دیا۔ وہ جب اپنے کتب خانہ میں محقق تھے تو انھیں ہوش بھی نہ تھا کہ گرد و پیش میں کیا ہو رہا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، وہ بس اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایسے محققین کے کارناموں کی مناسب اشاعت کی طرف قوم کو متوجہ ہونا چاہیے۔ مولانا کی کتابیں علمی تہی دستی کا نہیں، مالی وسائل کی ناپرسی کا مرثیہ ہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی انسان کتابیں اور دولت ساتھ ساتھ جمع نہیں کر سکتا، کیونکہ کتاب دوست کی دولت خریداری کتب میں صرف ہو جاتی ہے۔ مولانا نے محترم تو خود مرجع وقت کے صاحبزادہ ہیں۔ نہ ان کے والد نے دولت جمع کی اور نہ بیٹے نے اس کی میراث پائی۔ نہ وہ کوئی دولت جمع کر سکے اور نہ ان کی اولاد اس میں سے حظ پائے گی۔ اللہ انھیں ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے!

مولانا نے محترم کی کتابیں پڑھ کر آپ کی وسعت علمی اور قوتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی جولانگاہ زبان و ادب اور تاریخ کے میادین ہیں۔ واقعات کی تلاش، ان کی تنظیم، نشست و برخاست، اشیاء و افعال کی تفصیل اور ان کے اجزاء کا بیان، جزئیات کی تحقیق، ان کا تجزیہ و تحلیل اور پھر اخذ نتائج تاریخ کے اہم ترین اجزاء ہیں، جو مولانا کی تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مولانا موصوف کسی واقعہ کو اس لئے ضبط تحریر میں نہیں لاتے کہ وہ ”واقعہ“ ہے بلکہ واقعہ کی سماجی تاریخی (Sociopolitical) اہمیت کو بیان کرتے ہیں اور اس کے ضمنی اثرات کو اجاگر کر کے واقعہ کی اصل اہمیت و حیثیت کی وضاحت فرماتے ہیں۔ یہ طرزِ تحریر گوارد زبان میں نیا نہیں، ”شبلی“ کا مکتب بھی انھیں خطوط پر استوار تھا، لیکن ادب اور تاریخ کو باہم مزوج کر کے اس طرزِ ادا کو باقی رکھنا، بلاشبہ مولانا شمس صاحب ہی کا کام ہے وہ تاریخ لکھتے ہوئے بھی ادب لکھتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تاثر ہے، جس سے کوئی بھی اختلاف کا حق رکھتا ہے۔ میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا صاحب کی کون سی کتابیں کم

زیں جا توان شناخت کہ عالی مقام شد
بازیست خیر خاتمہ بالخیر گشت و بس
چیزش پسند ایزد و خیر الانام شد
تا نزع داشت سورۃ اخلاص ورد لب
اخلاص حق عیان بہمہ خاص و عام شد
در کاظمین گشت چو آسودہ زیر خاک
رحمت مجاور لحدش تاقیام شد
ناگاہ عقل طالب تاریخ سال فوت
از پیش گاہ ہاتف شیریں کلام شد
بگرفت حرف معجم و گفتابہ قلب صاف
از کاظمین راہی دارالسلام شد

۱۷۷۸ء

مختصر یہ کہ غلام رضا خاں نہایت خوش فکر اور خوش نصیب آدمی تھے۔ وہ ہر زمانہ میں کامیاب و بامراد رہے۔ ان کا قدیمی عالیشان مکان مرزا منڈی میں اب تک اچھی حالت میں موجود ہے مگر اب ایک ساہوچی کے قبضہ و تصرف میں ہے ان کا قبول اسلام گو شروع میں جان بچانے کو تھا بالنیت نہ تھا مگر بعد میں وہ بہت راسخ العقیدہ مسلمان ہو گئے تھے۔

(مدیر الواعظ :- شرف الدولہ کے عدل و انصاف کا ایک واقعہ جناب تاج العلماء سید علی محمد صاحب مجتہد مرحوم نے اپنے مواعظ ارشاد یہ چودہویں رات کے چاند موعظہ چہارم ص ۹۰ میں تحریر فرمایا ہے اس سے شرف الدولہ کے ذاتی حالات پر مزید تبصرہ ہوتا ہے۔)

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ، لکھنؤ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ / دسمبر

۱۹۵۲ء ص ۱۹ تا ۲۲



(بقیہ صفحہ ۲۲ کا۔۔۔)

ایک الماری سے رجسٹر نما کتاب نکال کر لائے اور فرمایا، ”یہ لو! یہ سید علی محمد تاج العلماء کی کتاب ’شرح جلالی‘ کا قلمی نسخہ ہے، جو میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ اس کا ایک جز کراچی یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ وہاں سے کاپی کروالینا۔ ہاں! مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسے حفاظت سے رکھنا تم، ماشاء اللہ! خود۔۔۔ میں نے سپاس گزاری کی اور آداب و تسلیما عرض کر کے آپ کی دعاؤں کے سائے میں رخصت ہو گیا۔

ان دو، تین واقعات سے مولانا کے تجربہ علمی، علم دوستی، طالبان علم کی حوصلہ افزائی، تحقیقی کاوشوں، نیز قوم کی بے بسی و بے مذاقی پر روشنی پڑتی ہے۔ قوم کا یہ فرض تھا (اور ہے) کہ مولانا کو تحقیق میں مصروف رہنے دیا جاتا ہے، ان سے علمی استفادہ کی صورتیں نکالی جاتیں، انھیں فکرِ معاش سے آزاد کر کے صرف علمی کام کرنے دیا جاتا اور ان کی کتابوں کی معقول اشاعت کے لئے کوئی ادارہ بنایا جاتا تو سیفِ قلم کا یہ دھنی ناقابل یقین علمی و تحقیقی سرمایہ چھوڑتا۔ جو کچھ آپ نے تحریر فرما دیا ہے، اب بھی بڑے کتب خانوں پر بھاری ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و پر پیدا

قطعات

صبر کے خانے میں جب اک نام لکھنا تھا مجھے
دیر تک سوچا کیا میں، کیا لکھوں، کیونکر لکھوں
کر بلا سے شام تک دیکھا، مگر ہوں فکر میں
ثانی زہرا لکھوں، عابد لکھوں، سرور لکھوں؟



مار کر دریا کو ٹھوکر تین دن کی پیاس میں
تشنہ کامی کو حیات جاویدانی دے گیا
ایسا دریائے عطش دنیا نے پھر دیکھا کہاں
حشر تک کے واسطے آنکھوں کو پانی دے گیا



منظر حسین تاج لکھنؤی